# مٹی میں آسمان

شکیل اعظمی

آپ کے یہاں دوسروں سے ہٹ کر بات کرنے کا خاص سلیقہ ہے جو قابلِ قدر ہے۔

۷/نومبر ۱۹۹۸ء (پاکستان) ڈاکٹر وزیر آغا

شکیل اعظمی غزل اور نظم دونوں اصناف سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، لیکن عملی حصول کے تناظر میں وہ ذہنی طور پر غالباً غزل کے اور نظم کے تعلق سے آزاد نظم کے ترجیحاً زیادہ قریب ہیں۔ جہاں غزل کے کلاسیکی اہتمام میں وہ تازہ کار عصری احساس کی آمیزشوں سے مختلف النوع کیفیات کا جادو جگاتے ہیں وہاں نظم میں وہ عام زندگی کے تجربوں، ذاتی وابستگیوں او محرومیوں، شخصی اور اجتماعی ترسیل کی صورتوں اور عصری زندگی کے تضادات اور احساسِ زیاں کی تجسیم کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ایش ٹرے، ایکسیڈنٹ، سیلز گرل جیسے انگریزی الفاظ اردو الفاظ میں ایسے رچ بس کر سامنے آئے ہیں کہ تخلیقی طور پر انہی کی توسیع محسوس ہوتے ہیں۔

۱۳/اپریل ۱۹۹۷ء (دہلی) بلراج کومل

شکیل اعظمی کے یہاں احساس کی جو آگ نظر آتی ہے وہ نئی نسل کے بہت کم شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ روایتی اسالیب وافکار سے انحراف اور سادہ فطری تخلیقی اظہار شکیل اعظمی کا شناس نامہ ہے۔

۱۲/مارچ ۲۰۰۵ء (دہلی) پروفیسر گوپی چند نارنگ

شکیل اعظمی کو میں ندا فاضلی اور محمد علوی کے بعد آسمان ادب پر ایک نئے ستارے کی طرح دیکھ رہا ہوں۔

یکم نومبر ۱۹۹۹ء (احمد آباد) پروفیسر وارث علوی

# مٹی میں آسمان

شکیل اعظمی



زیرِ اہتمام:
عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

MITTI MEIN AASMAAN
by Shakeel Azmi
5-B/002, Narendra Park Venus,
Naya Nagar, Mira Road (E)
Mumbai-401107 (India)
Email : shakeelazmi3@gmail.com
Mob.: 9820277932
Ist Edition : 2012
₹: 200/-

نام کتاب : مٹی میں آسمان

شاعر و ناشر : شکیل اعظمی

تعداد : پانچ سو

زیر اہتمام : روپ کمار راٹھوڑ، سیوی علی

سرورق : شاہد علیگ



**arshia publications**
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: (0) 9899706640, 9971775969 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

Composed at: Frontech Graphics 9818303136

اپنے ماموں ارشاد احمد خان کے نام

جن کی گالیوں نے مجھ میں حس پیدا کی، جن کی سختیوں نے میری خاموشی کو زبان عطا کی اور جن کی پابندیوں نے میرے قدموں کو راستہ دیا۔

شاعری نے مرے لوگوں کو جدا مجھ سے کیا
یہ جراثیم مری جان سے کب نکلیں گے

❖

معین احسن جذبی کی یاد میں

ادب اور مٹی کے حوالے سے

اس کتاب کی اشاعت میں
گجرات اُردو ساہتیہ اکادمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

غالبؔ

جو ہے اسے غور سے دیکھو تو تمہیں وہ بھی نظر آئے گا جو بظاہر نہیں ہے۔

شکیل اعظمی

# فہرست

## غزلیں

## نظمیں

## غزلیں

# شکیل اعظمی، زندگی اور شاعری

شکیلؔ اعظمی کی شاعری میں فکر و احساس، بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ احساس و فکر کا وہ خوبصورت اور متناسب امتزاج ملتا ہے جو اچھی شاعری کی اوّلین پہچان ہے۔ وہ محض تجربے کے لیے شعر نہیں کہتے بلکہ اپنے وجودی تجربے کو شعری پیکر میں ڈھالنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ آج کی زندگی کے تضادات جو بمبئی جیسے کاروباری شہر میں زیادہ شدت سے محسوس کیے جاسکتے ہیں شکیلؔ کے خوصی موضوعات ہیں لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ نہ اپنے آپ کو غیر مشروط طور پر ان حالات کے حوالے کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں اور نہ ہی ان سے پوری طرح چشم پوشی کرتے ہیں بلکہ وہ اسے ایک زندہ حقیقت مان کر قبول کر لیتے ہیں۔ شکیلؔ کی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ حالات سے گھبرا کر اپنے آپ کو کسی خول میں بند نہیں کرتے بلکہ جو کچھ بیتتی ہے اس کا غیر منافقانہ اظہار کرنا بھی اپنی ذمے داری سمجھتے ہیں:

ذلیل کر مجھے لیکن بہت ذلیل نہ کر
یہ زہر میں بھی تو جا کر کہیں نکالتا ہوں

---

وہی ہے دائرہ مجھ پر کئی نگاہوں کا
وہی جواب سے خالی مرے سوال کے دن

---

ڈھہ گئے اک ذرا ہوا جو چلی
کیا کریں ریت کا مکان تھے ہم

---

راستہ ہے کہ پکارے ہی چلا جاتا ہے
میں بھی تھکتا نہیں گھوڑا بھی نہیں رکتا ہے

---

نہ میرے چہرے پہ داڑھی نہ سر پہ چوٹی تھی
مگر فساد نے پتھر مجھے بھی مارا تھا

---

تپش اک اور ہے دن کی حرارتوں کے سوا
سفر اک اور ہے سورج ترے زوال کے بعد

---

رات بھر جلتا رہا ہوں میں چراغوں کی طرح
صبح ہونے کو ہے اب مجھ کو بجھائے کوئی

---

آسماں صرف ستارہ ہی ہمیں جانتا ہے
خاک میں ہوتے اگر ہم تو خزانے ہوتے

---

مری زمین! مری دھوپ سے گریز نہ کر
مجھے سمجھ کہ میں برسات کی علامت ہوں

---

اگر بجھے تو دھواں بن کے پھیل جائیں گے
ہوا میں جل کے ہمیں اطمنان زیادہ ہے



افلاطون کا کہنا ہے کہ اشیاء کا ٹوٹ جانا بڑا حادثہ نہیں ہوتا۔ اشیاء کے تصور کا ٹوٹ جانا بڑا حادثہ ہوتا ہے۔ شکیل اعظمی کی شاعری پڑھتے ہوئے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اشیاء کے ٹوٹنے یا گم ہونے سے اس لیے پریشان نہیں

ہیں کہ ان کے یہاں شئے کا تصور اب بھی باقی ہے۔ شکیلؔ اعظمی اعظم گڑھ جیسے اوسط درجے کے شہر کے رہنے والے ہیں یقینی طور پر ان کے یہاں ان اقدار کی زیادہ اہمیت ہوگی جو ایک مدت سے چھوٹے اور متوسط درجے کے شہروں کا طرۂ امتیاز بنی ہوئی ہیں یہی وجہ ہے کہ جب شکیلؔ کا سابقہ بمبئی جیسے بڑے اور مشینی شہر میں مشینی انسانوں سے پڑتا ہے تو انہیں ایک ذہنی جھٹکا تو لگتا ہے لیکن وہ اسے بھی ایک حقیقت سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں اور اس پر کسی قسم کا فخر یا ندامت محسوس نہیں کرتے اور نہ اس کی مذمت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ زندگی تو سفید و سیاہ رنگوں کے امتزاج ہی سے عبارت ہے۔ زندگی کے یہ دونوں رنگ شکیلؔ کے یہاں رویے کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں جنھیں وہ ایک فنکارانہ فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ اس میں اکثر کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ زندگی کو اس کے اصل روپ میں قبول کرنے کا تجربہ بھیانک بھی ہوتا ہے اور خوبصورت بھی اور یہ دونوں رویے شکیلؔ اعظمی کے یہاں پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں یہاں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ شکیلؔ اعظمی ان دونوں تجربات کا اظہار نہایت ایمانداری سے کرتے ہیں شاید وہ زندگی کے تئیں بھی ایک کھلا رویہ رکھتے ہیں اور یہی کھلا پن ان کی شاعری میں کشادگی بھی پیدا کرتا ہے اور تاثر بھی۔ کسی تجربے کے سلسلے میں ان کا غیر جذباتی اور معروضی انداز انھیں زندگی کو ہر صورت میں قبول کرنے کی جرأت عطا کرتا ہے۔ شکیل کا یہ حقیقت پسندانہ رویہ ان کے ہمعصروں کے یہاں کم کم ہی نظر آتا ہے:

حقیقتوں کے سفر میں گمان زیادہ ہے
یہ زندگی ہے یہاں امتحان زیادہ ہے

---

جاؤ مٹی میں ملو، فصل بنو، بیج ہو تم
منھ چھپائے ہوئے کھلیانوں میں کیوں رہتے ہو

---

نہ سرد ہوتے ہیں موسم نہ دھوپ لگتی ہے
کوئی نکال رہا ہے بہت سنبھال کے دن

---

پروں کو کھول زمانہ اُڑان دیکھتا ہے
زمیں پہ بیٹھ کے کیا آسمان دیکھتا ہے

---

کما کے پورا کیا جتنا بھی خسارہ تھا
وہیں سے جیت کے نکلا جہاں میں ہارا تھا

---

سر گئے قبر میں دستار پڑی ہے گھر میں
اک وراثت ہے جو بیکار پڑی ہے گھر میں

---

کچھ تو رفتار بھی کچھوے کی طرح ہے اپنی
اور کچھ وقت بھی خرگوش ہوا جاتا ہے

---

تمام فصلیں اُجڑ چکی ہیں نہ ہل بچا ہے نہ بیل باقی
کسان گروی رکھا ہوا ہے لگان پانی میں بہہ رہا ہے

---

کھیل ہے اب ہر طرف تصویر کا
لفظ سارے بے معانی ہو گئے

---

اچھی ہے یا بری ہے چاہے جیسی ہے دنیا
آیا ہوں تو کچھ دن یہاں ٹھہرنا بھی تو ہے

شکیلؔ اعظمی کا بنیادی مسئلہ زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار اور بیتی ہوئی زندگی کی یادوں کا ٹکراؤ ہے۔ یہ ٹکراؤ اُن کی غزلوں میں بھی ملتا ہے اور نظموں میں بھی

فرق صرف یہ ہے کہ وہ غزلوں میں بڑی حد تک داخلی نقطۂ نظر کو اجاگر کرتے ہیں جب کہ نظموں میں ان کا رویہ Third Person کا سا ہے۔ وہ غیر جانبدار ناظر کی طرح اپنے اطراف و اکناف پر نظر ڈالتے ہیں اور جو کچھ دیکھتے ہیں اسے بلا تبصرہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی دکھا دینا چاہتے ہیں اور اسی لیے ان کی بیشتر نظمیں لینڈ اسکیپ کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ ان نظموں میں ان کی اپنی رائے یا ان کا اپنا زاویۂ نظر نمایاں نہیں ہوتا اور شاید وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں اکثر صورتِ حال کی ہو بہو عکاسی کر کے وہ قاری کے لیے اپنے طور پر سوچنے کی راہیں کھلی چھوڑ دیتے ہیں اور ان کھلی ہوئی راہوں میں جو کچھ کھویا ہوا سا یا ان دیکھا سا ہے اسے تلاش کرنے پر مجبور کرتے ہیں کیونکہ آج کے دور میں کوئی ایک نقطۂ نظر یا فلسفۂ حیات پوری زندگی پر محیط نہیں ہو سکتا اس کے باوجود ان کا بنیادی رویہ 'تھا' اور 'ہے' کی کشمکش سے جنم لیتا ہے وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسے سیدھے سادے انداز میں ایک تہہ دار بیانیے کا روپ دے دیتے ہیں جیسے ان کی نظم 'جنگل کا آدمی' جس میں انھوں نے اپنے تصور کی مدد سے جنگل میں رہنے والے انسانوں کی زندگی کا قصہ بڑی خوش اسلوبی سے سنایا ہے:

آکاش رہا چھپر میرا
یہ دھرتی تھی بستر میرا
سورج کو خدا بنایا تھا
اک نور اسی سے پایا تھا
پتھر سے آگ جلائی تھی
لکڑی سے ناؤ بنائی تھی
سر پر دو سینگ سنوارے تھے
تیروں سے درندے مارے تھے

پوشاک بنی تھی پتوں سے
رشتہ تھا عجب درختوں سے
پھل سارے مری غذائیں تھے
گل بوٹے مری دوائیں تھے
گرمی سے تن کو ڈھانپا تھا
سردی کو جلا کر تاپا تھا
بادل برسے تو بھیگ گیا
جب دھوپ کھلی تو سوکھ گیا
میں چھتری کے بن چلتا تھا
موسم کے ساتھ بدلتا تھا
جب میں جنگل میں رہتا تھا

اس نظم میں شاعر نے ہزاروں سال پہلے کی انسانی زندگی کو اپنے تصور میں جی کر دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس زندگی پر واضح انداز میں کوئی حکم نہیں لگایا ہے لیکن بین السطوری معنویت یہ احساس دلاتی ہے کہ اس کے ذہن میں صدیوں پرانی زندگی آج بھی زندہ ہے اور وہ اسے اپنی طرف کھینچ رہی رہے۔ شاید اس کے رشتے کہیں نہ کہیں آج کی زندگی سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔
دیہاتوں سے بڑے شہروں تک کا فاصلہ جہاں خارجی طور پر مختلف اچھے برے مناظر کا منظر نامہ پیش کرتا ہے وہیں داخلی طور پر ماضی و حال کی کشمکش کا المیہ بھی بن جاتا ہے۔ شکیلؔ کی نظمیں انہی داخلی اور خارجی منظر ناموں کا مجموعہ ہیں۔ اس مجموعے میں جانور، روشنی کا سفر، سیلاب، اندر سے باہر تک، سردی کی صبح، اور بارش کی رات بھی اسی قبیل کی خوبصورت نظمیں ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر بیک وقت دو دنیاؤں میں جی رہا ہے ایک وہ دنیا جو اپنے ذہن و دل میں آباد کر رکھی ہے اور دوسری وہ دنیا جس میں زندگی کرنے اور زندہ رہنے کے وسائل تلاش کرنے کی جدو جہد اس کا مقدر ہے۔ جن نظموں میں خارجی منظر نامہ پیش کیا گیا ہے وہ ایک صورتِ حال کو پیش کر کے خاموش ہو جاتی ہیں لیکن اس خاموشی کی گونج دیر تک قاری پر طاری رہتی ہے۔ اس قسم کی نظموں میں 'مٹی میں آسمان' اور 'مٹی کا دُکھ' قابلِ ذکر ہیں۔ کچھ نظمیں ایسی ہیں جن میں داخلی منظر نامہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے ان نظموں میں اشاراتی انداز میں شاعر کا ذاتی نقطۂ نظر بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے لیکن یہاں بھی نظریے کو کسی نعرے یا واضح لفظیات کا سہارا لیے بغیر ہی پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً:

آگ سے بھرا سورج
جسم میں اترتا ہے
خون چوس لیتا ہے
ہونٹ سوکھ جاتے ہیں
آب آب کرتے ہیں
دھول اُڑتی رہتی ہے (گرمی کی دوپہر)

رات لمبی ہے
چاند آدھا ہے
نیند آئے تو کس طرح آئے
زندگی کم ہے
کام زیادہ ہے (آدھا چاند)

شکیلؔ اعظمی کی یہ نظمیں ان کے داخلی و خارجی دونوں رویوں کی نمائندگی

کرتی ہیں۔ پہلی نظم میں صرف ایک منظر اُبھرتا ہے اور دوسری نظم میں منظر کے ساتھ شاعر کی شخصیت اور فکر کا پہلو بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ دوسری نظم میں ابتدائی تین مصرعے غیر جانبدار ناظر کی حیثیت سے پیش کیے گئے ہیں لیکن آخری دو مصرعوں میں شاعر کی شمولیت نظم کو ایک نئی معنویت سے روشناس کراتی ہے۔ شکیلؔ اعظمی کی بیشتر نظموں میں اسی تکنیک سے کام لیا گیا ہے اور اکثر یہ تکنیک بھرپو راور کامیاب ثابت ہوئی ہے۔

شہر میں جنگل، باہر کی لڑکی، اور دُور بڑے شہروں سے متعلق پر اثر نظمیں ہیں جہاں زندگی Mechenical انداز میں گزرتی ہے اور جہاں بندھے ٹکے اعمال او راُن کے بندھے ٹکے نتائج ایک اُکتا دینے والی یکسانیت پیدا کرتے ہیں۔ زندگی کی مشینیت فرد کو بھی ایک مشین میں تبدیل کر دیتی ہے اور اس کا ہر عمل سطحی بن کر رہ جاتا ہے اور پھر اس مشینیت سے بچنے کے لیے کسی ان دیکھے کی تلاش آخری سہارا بن جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک نظم ہے 'پس منظر کی تلاش':

میں
درختوں
پہاڑوں سے
ہوتا ہوا
جستجو میں تری
آسمانوں کو چھو کر پلٹ آیا ہوں
تو کہاں ہے
ذرا مجھ کو آواز دے

شاعر کی یہی تلاش مختلف پیرایوں کے ساتھ 'مایوسی' اور 'زلزلہ' نظموں میں بھی نظر آتی ہے۔ شکیلؔ اعظمی کی رومانویت بھی اسی جذبے کی ایک ٹھوس شکل ہے

جسے ان کی نظم 'چاہت کے پھول' میں دیکھا جاسکتا ہے:

خواب میں اک حسین لڑکی نے
پیار سے اک قلم دیا مجھ کو
اور کہا کہ میں اس کا نام لکھوں
اس کو قدرت کا شاہکار لکھوں
صبح اٹھا تو میری آنکھوں میں
اس کی چاہت کے پھول روشن تھے
اور خوشبو بدن میں پھیلی تھی

شکیل اعظمی نئے شعراء کے اس گروہ سے متعلق بھی ہیں اور اس میں اہم بھی جو غیر مشروط انداز میں اپنا اظہار چاہتا ہے اور اپنے اندر کی آگ کو اپنے آنسوؤں سے بجھائے بغیر کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ شعراء جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اسے بے کم و کاشت اپنے طور پر بیان کر دیتے ہیں اور یہی بیان ان کی فنکاری کا سب سے بڑا وصف ہے جو ان میں سچائیوں سے آنکھ ملانے اور زندگی کے ملبے سے خود کو سمیٹ کر دوبارہ نئی زندگی کی شروعات کرنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔

شکیل اعظمی کی شاعری کا تخلیقی بہاؤ طے شدہ دھارے کی حد بندیوں کو توڑ کر غیر مشروط دشاؤں میں پھیلتا ہے ان کی شاعری اپنی زمین خود تلاش کرتی ہے وہ نہ تو نظم کہنے سے پہلے نظم کا عنوان ڈھونڈتے ہیں اور نہ ہی سوچ سمجھے ردیف و قوافی کے ساتھ غزل کہنے کے ذہنی کسرتی عمل سے گزرتے ہیں۔ غزل ہو یا نظم ان کے الفاظ اپنے دروبست کے ساتھ کیفیت میں ضم ہو جاتے ہیں اور یہ سب تخلیقی سطح پر شعور میں لاشعور اور لاشعور میں شعور کے فنکارانہ امتزاج کے ساتھ آپ ہی آپ ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج زندگی ہر قدم پر سو سو سوال کھڑے کرتی ہے

جن کا کوئی ایک یا آخری جواب کسی کے پاس نہیں۔ خود زندگی کے پاس بھی نہیں کہ زندگی ہزار شیوہ ہوتی ہے اور ہر شیوے کے ہزار رنگ و اسرار ہوتے ہیں۔ ان تمام رنگوں کو سمیٹنا اور ان کے اسرار کو کھولنے کی جد و جہد ہر فنکار کا مقدر ہے اور ہر فنکار کی اپنی بساط بھر کوشش کے باوجود ہمیشہ کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ ناتمامی کا یہی احساس فنکار کو نئی تخلیق پر اُکساتا رہتا ہے۔ یہ ایسا عمل ہے جس سے کسی بھی زندہ فنکار کو مفر نہیں۔ شکیلؔ اعظمی کا شعری سفر بھی پیش آمدہ سوالوں کے جواب کی تلاش جاری رکھنے کا ایک وسیلہ ہے جو وقفے وقفے سے ایک تازہ او رنئے مجموعے کی شکل میں قارئین تک پہنچتا رہتا ہے۔ دھوپ دریا، ایش ٹرے، راستہ بلاتا ہے، اور خزاں کا موسم رکا ہوا ہے کی طرح 'مٹی میں آسمان' بھی زندگی کے سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی ایک بھرپور کوشش ہے اور اسی لیے قابلِ قدر ہے۔

۳ر جون ۲۰۱۲ء (اورنگ آباد)

۔بشر نواز

❖

کہیں کوئی ہے جو نبضِ دنیا چلا رہا ہے وہی خدا ہے
جو ہو کے غائب کمال اپنے دکھا رہا ہے وہی خدا ہے

اندھیری راتوں کے آنچلوں میں جو جھلملاتا ہے نور بن کر
جو چاند تاروں سے آسماں کو سجا رہا ہے وہی خدا ہے

سحر کی مہکی ہوئی فضا میں سنہرے سورج کا تاج پہنے
جو وادیوں پہ گلوں کی چادر بچھا رہا ہے وہی خدا ہے

یہ چہچہاتے ہوئے پرندے عبادتوں میں ہیں جس کی شامل
درخت سجدے میں جس کے سر کو جھکا رہا ہے وہی خدا ہے

غذائیں پہنچا رہا ہے گہرے سمندروں میں جو مچھلیوں کو
چمکتے موتی جو سیپیوں میں بنا رہا ہے وہی خدا ہے

جو بن کے بادل زمیں پہ برسے، زمیں کو سینچے، اُگائے سبزے
جو کچی فصلوں کو دھوپ بن کر پکا رہا ہے وہی خدا ہے

کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں سے کبھی سمندر کے ساحلوں سے
بغیر بولے جو اپنی جانب بلا رہا ہے وہی خدا ہے

❖

نہ پھل، نہ پھول، نہ پتے، گئے جمال کے دن
درخت کاٹ رہے ہیں کڑے زوال کے دن

وہی ہے دائرہ مجھ پر کئی نگاہوں کا
وہی جواب سے خالی مرے سوال کے دن

وہی ہے روح سے ہمسائیگی عذابوں کی
وہی گناہ کی راتیں وہی ملال کے دن

ابھی بھی بوجھ ہے پلکوں پہ رتجگوں کا ترے
ابھی بھی مجھ میں ہیں روشن ترے خیال کے دن

نہ سرد ہوتے ہیں موسم نہ دھوپ لگتی ہے
کوئی نکال رہا ہے بہت سنبھال کے دن

اسی کے ہاتھ میں سب راز روشنی کے ہیں
بکھیرتا ہے زمیں پر وہی اُچھال کے دن

بڑا غرور تھا مجھ کو بھی اپنی آنکھوں پر
کہیں یہ لوگ بھی اندھے نہ ہوں نکال کے دن

اپنی ہستی کو مٹا دوں، ترے جیسا ہو جاؤں
اس طرح چاہوں تجھے میں ترا حصہ ہو جاؤں

پائلیں باندھ کے بارش کی کروں رقص جنوں
تو گھٹا بن کے برس اور میں صحرا ہو جاؤں

دور تک ٹھہرا ہوا جھیل کا پانی ہوں میں
تیری پرچھائیں جو پڑ جائے تو دریا ہو جاؤں

شہر در شہر مرے عشق کی نوبت باجے
میں جہاں جاؤں ترے نام سے رسوا ہو جاؤں

آدمی بن کے بہت میں نے تجھے سجدے کیے
تو خدا بن کے مجھے مل میں فرشتہ ہو جاؤں

اس طرح مل کہ بچھڑنے کا تصور نہ رہے
اس طرح مانگ مجھے تو کہ میں تیرا ہو جاؤں

اتنا بیمار کہ سانسوں سے دھواں اٹھتا ہے
آ تجھے دیکھ لوں اور دیکھ کے اچھا ہو جاؤں

زندگی کی نئی اڑان تھے ہم
اپنی مٹی میں آسمان تھے ہم

چاند نے رات گھر پہ دستک دی
رات بھر اس کے میزبان تھے ہم

ڈھہہ گئے اک ذرا ہوا جو چلی
کیا کریں ریت کا مکان تھے ہم

جب تلک اس نے ہم سے باتیں کیں
جیسے پھولوں کے درمیان تھے ہم

اس کو چپ چاپ سن لیا ہم نے
جیسے سچ مچ کے بے زبان تھے ہم

جس سے ملتی تھی جھوٹ کی سرحد
اس حقیقت سے بدگمان تھے ہم

لوگ سمجھے نہیں ہمیں شاید
مسجدوں سے اُٹھی اذان تھے ہم

کما کے پورا کیا جتنا بھی خسارہ تھا
وہیں سے جیت کے نکلا جہاں میں ہارا تھا

نہ میرے چہرے پہ داڑھی نہ سر پہ چوٹی تھی
مگر فساد نے پتھر مجھے بھی مارا تھا

جہاں پہ لوگ مری جان لینا چاہتے تھے
اسی گلی سے گزرنا مجھے دوبارہ تھا

ہوا چلی تو مجھے اس نے پھر کیا روشن
بچا ہوا جو مری راکھ میں شرارہ تھا

کہانی سنتے ہوئے بجھ گئی تھیں سب آنکھیں
جو جل رہا تھا مرے ساتھ اک ستارہ تھا

جہاں سے دیکھ رہا تھا میں بہتے دریا کو
وہیں سے ٹوٹ کے گرتا ہوا کنارہ تھا

کئی مکان تھے لیکن کھلا نہ مجھ پہ کوئی
ہر اک مکان پہ میں نے تجھے پکارا تھا

❖

دنیا اک دریا ہے پار اترنا بھی تو ہے
بے ایمانی کرلوں لیکن مرنا بھی تو ہے

پتھر ہوں بھگوان بنا رہ سکتا ہوں کب تک
ریزہ ریزہ ہو کے مجھے بکھرنا بھی تو ہے

ایسے مجھ کو مارو کہ قاتل بھی ٹھہروں میں
آخر یہ الزام کسی پہ دھرنا بھی تو ہے

دل سے تم نکلے ہو تو کوئی اور سہی کوئی اور
یہ جو خالی پن ہے اس کو بھرنا بھی تو ہے

باندھ بنانے والوں کو معلوم نہیں شاید
پانی جو ٹھہرا ہے اسے گزرنا بھی تو ہے

ساحل والو ابھی تماشہ ختم نہیں میرا
ڈوب رہا ہوں لیکن مجھے اُبھرنا بھی تو ہے

اچھی ہے یا بری ہے چاہے جیسی ہے دنیا
آیا ہوں تو کچھ دن یہاں ٹھہرنا بھی تو ہے

سر گئے قبر میں دستار پڑی ہے گھر میں
اک وراثت ہے جو بیکار پڑی ہے گھر میں

دھول اُڑاتی ہے ہوا جنگ کے میدانوں میں
زنگ کھاتی ہوئی تلوار پڑی ہے گھر میں

کشتیاں بہہ گئیں سیلاب ہے چاروں جانب
ایک ٹوٹی ہوئی پتوار پڑی ہے گھر میں

ہم نے آنکھوں میں چھپا رکھی تھی باہر کی گھٹا
اب جو برسی ہے تو بوچھار پڑی ہے گھر میں

میں اِدھر رہتا ہوں ٹوٹے ہوئے آئینے سا
ایک صورت ہے جو اُس پار پڑی ہے گھر میں

میں کہیں کھویا ہوا ہوں کسی پازیب کے ساتھ
اور بکھری ہوئی جھنکار پڑی ہے گھر میں

ایک چوکھٹ سے ہی سب آتے ہیں جاتے ہیں مگر
اندر اندر کوئی دیوار پڑی ہے گھر میں

پروں کو کھول زمانہ اڑان دیکھتا ہے
زمیں پہ بیٹھ کے کیا آسمان دیکھتا ہے

جو چل رہا ہے نگاہوں میں منزلیں لے کر
وہ دھوپ میں بھی کہاں سائبان دیکھتا ہے

کھنڈر میں کس کو محل کی تلاش لے آئی
یہ کون رک کے مری آن بان دیکھتا ہے

یہی وہ شہر جو میرے لبوں سے بولتا تھا
یہی وہ شہر جو میری زبان دیکھتا ہے

ملا ہے حسن تو اس حسن کی حفاظت کر
سنبھل کے چل تجھے سارا جہان دیکھتا ہے

کنیز ہو کوئی یا کوئی شاہزادی ہو
جو عشق کرتا ہے کب خاندان دیکھتا ہے

گھٹائیں اٹھتی ہیں برسات ہونے لگتی ہے
جب آنکھ بھر کے فلک کو کسان دیکھتا ہے

میں جب مکان کے باہر قدم نکالتا ہوں
عجب نگاہ سے مجھ کو مکان دیکھتا ہے

❖

کدھر کو جاؤں، کہ ہوتا نہیں اشارہ کوئی
کہیں سے ٹوٹ کے گرتا نہیں ستارہ کوئی

یہ کس عذاب میں ڈوبا ہوا ہے گاؤں مرا
ندی بچی ہے نہ آنکھوں میں ہے کنارہ کوئی

کسی کا سر مرے قدموں کے ساتھ چلتا ہے
چھپا ہوا ہے زمینوں میں رہگزارہ کوئی

جسے بھی دیکھیے آنکھیں بچھائے بیٹھا ہے
یہ چار راہ بھی لگتی ہے انتظارہ کوئی

جو دور ہی سے مجھے دیکھ کے گزرتا ہے
قریب آئے تو بن جائے استعارہ کوئی

جہاں سے تیری صدا کا گمان گزرا تھا
پکارتا ہے وہیں سے مجھے دوبارہ کوئی

وہ میں نہیں ہوں مگر ہوں اسی کے اندر میں
پہن کے گھوم رہا ہے مرا اُتارا کوئی

یہ کیسا فرق پسندیدگی میں آیا ہے
کہ اب نظر میں ٹھہرتا نہیں نظارہ کوئی

❖

جہاں ہے چھت مری، در بھی وہیں نکالتا ہوں
میں اپنے قدموں سے اپنی زمیں نکالتا ہوں

کھڑی ہے پھر کوئی دیوار میرے رستے میں
لہولہان میں پھر سے جبیں نکالتا ہوں

یہ سانپ میرے گلے سے لپٹنے لگتے ہیں
میں اپنے کرتے سے جب آستیں نکالتا ہوں

زمانہ ہو گیا تونے جسے گرایا تھا
میں اُس مکان سے اب تک مکیں نکالتا ہوں

ذلیل کر سے مجھے لیکن بہت ذلیل نہ کر
یہ زہر میں بھی تو جا کر کہیں نکالتا ہوں

اے بمبئیٰ! میں تجھے وارتا ہوں تجھ پر ہی
جو تونے مجھ کو دیا ہے یہیں نکالتا ہوں

ندی بھی آج اکیلی ہی بہنا چاہتی ہے
تو آج میں بھی یہ کشتی نہیں نکالتا ہوں

❖

حقیقتوں کے سفر میں گمان زیادہ ہے
یہ زندگی ہے یہاں امتحان زیادہ ہے

یہ انکشاف بہت دیر سے ہوا مجھ کو
جہاں ہے دھوپ وہاں سائبان زیادہ ہے

یہی کسان کی تقدیر ہے زمانے سے
اناج کھیت میں کم ہے لگان زیادہ ہے

زمین اس لیے ناراض رہتی ہے ہم سے
ہمارے سر پہ ہی کیوں آسمان زیادہ ہے

تمہارے پیار سے بھرتا نہیں ہے دل میرا
اک آدمی کے لیے یہ مکان زیادہ ہے

لبوں پہ چمکا نہ آنکھوں میں جھلملایا کبھی
ہمارا درد ہی کچھ بے زبان زیادہ ہے

اگر بجھے تو دھواں بن کے پھیل جائیں گے
ہوا میں جل کے ہمیں اطمنان زیادہ ہے

زیادہ لفظ کو میں بہ وزن فعلن بھی درست مانتا ہوں۔

❖

فائدہ ڈھونڈ لو، نقصانوں میں کیوں رہتے ہو
ہوش والے ہو تو دیوانوں میں کیوں رہتے ہو

کس لیے کرتے ہو تم شہر میں جنگل آباد
جانور کی طرح انسانوں میں کیوں رہتے ہو

گھر کے اندر کسی آئینے میں دیکھو خود کو
کھوج میں اپنی بیابانوں میں کیوں رہتے ہو

درد میں خود ہی قیامت کا نشہ ہوتا ہے
زخم رکھتے ہو تو میخانوں میں کیوں رہتے ہو

جاؤ مٹی میں ملو، فصل بنو، بیج ہو تم
منھ چھپائے ہوئے کھلیانوں میں کیوں رہتے ہو

خوشبوؤں کا تو ہواؤں سے بڑا رشتہ ہے
تم مہکتے ہو تو گلدانوں میں کیوں رہتے ہو

گھر کا حصہ بنو، کچھ بوجھ اُٹھاؤ گھر کا
میزبانی کرو مہمانوں میں کیوں رہتے ہو

❖

ندی، پہاڑ، سمندر، ہوا میں بٹ جاؤ
بہت بڑی ہے یہ دنیا جڑوں سے کٹ جاؤ

زمین مانگ رہی ہے حسابِ وقتِ قیام
جہاں کھڑے ہو مری جاں وہاں سے ہٹ جاؤ

یہی طریقے ہمیشہ رہے ہیں جینے کے
بڑھا لو چادریں یا خود میں ہی سمٹ جاؤ

اس انجمن میں ہر اک آدمی اکیلا ہے
اندھیرا ہو تو کسی جسم سے لپٹ جاؤ

تمام رات تو سو کر گزار دی تم نے
سویرا ہو گیا اب نیند سے اُچٹ جاؤ

دعائیں مانگ رہا ہوں میں بارشوں کے لئے
مرے لہو! مرے کھیتوں کی طرح پھٹ جاؤ

یہاں سے آگے کوئی راستہ نہیں جاتا
اب اپنے اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاؤ

اُجالے بانٹتے پھرتے ہو شہر بھر میں شکیلؔ
چراغ لے کے کبھی اپنے بھی نکٹ جاؤ

❖

غرض کہ ٹوٹ چکا ہوں مگر سلامت ہوں
بچا ہوا اسی احساس کی بدولت ہوں

کٹوں گا میں تو بہاؤں گا خون تیرا بھی
سمجھ کہ تیری طرح میں بھی بے مروت ہوں

اُٹھے جو ہاتھ تو ہاتھوں میں آگئے تارے
میں اپنے آپ میں کتنا دراز قامت ہوں

کسی سفر میں تو نقشِ قدم ملیں گے مرے
تو مجھ کو ڈھونڈ اگر میں تری ضرورت ہوں

مری زمین! مری دھوپ سے گریز نہ کر
مجھے سمجھ کہ میں برسات کی علامت ہوں

ہزار رنگ اُبھر کر مٹیں گے دنیا میں
رہوں گا میں کہ میں جدّت نہیں روایت ہوں

نہ جانے کب وہ مجھے خرچ کر دے مجبوراً
میں اک غریب کے گھر میں رکھی امانت ہوں

❖

سبھی ہیں جھوٹے تو سچ میں ہی بول کر دیکھوں
بہت اندھیرا ہے لیکن ٹٹول کر دیکھوں

مرا چراغ بجھے گا یا روشنی ہوگی
ہوا کے ساتھ یہ جھگڑا بھی مول کر دیکھوں

پتا چلے کہ مرا شہر کتنا بے حس ہے
فضا میں زہر کسی روز گھول کر دیکھوں

یہ دیکھنا ہے وہ کتنا قریب آتا ہے
اُس اجنبی سے ذرا میل جول کر دیکھوں

پکڑ رکھے ہیں کئی خواب میری آنکھوں نے
جو نیند آئے تو دروازہ کھول کر دیکھوں

سنا ہے عشق میں دیوانگی ضروری ہے
تو ایک لَے میں بدل میں بھی ڈول کر دیکھوں

تو زندگی ہے تو ہو جاؤں میں فنا تجھ میں
تو فلم ہے تو کوئی میں بھی رول کر دیکھوں

❖

سنگ تھے، پگھلے تو پانی ہو گئے
ہم وہ پتھر ہے جو کہانی ہو گئے

کھیل ہے اب ہر طرف تصویر کا
لفظ سارے بے معانی ہو گئے

بات کرنی تھی ہمیں جس سے بہت
ہم اسی کی بے زبانی ہو گئے

چند قطرے رہ گئے تھے آنکھ میں
وہ بھی دریا کی روانی ہو گئے

سبز موسم آگیا تھا روم میں
آئینے بھی دھانی دھانی ہو گئے

آسماں پر رہ کے بھی تم خاک ہو
ہم زمیں پر آسمانی ہو گئے

چھاؤں میں گوتم کی کیا بیٹھے شکیلؔ
تھوڑے تھوڑے ہم بھی گیانی ہو گئے

راہ میں گھر کے اشارے بھی نہیں نکلیں گے
چاند ڈوبا تو ستارے بھی نہیں نکلیں گے

ڈوبنے کے لیے ساحل پہ کھڑا ہوں میں بھی
بند شیں توڑ کے دھارے بھی نہیں نکلیں گے

ٹھہر اے سیلِ رواں! ورنہ یہ بستی ہی نہیں
تیرے غرقاب کنارے بھی نہیں نکلیں گے

میری بستی بڑی مفلس ہے مگر اے حاتم
لوگ یوں ہاتھ پسارے بھی نہیں نکلیں گے

تم عجب لوگ ہو آنگن کے لیے روتے ہو
اب مکانوں میں اُسارے بھی نہیں نکلیں گے

رات بھر جاگ کے ہم نے جو کمائی کی ہے
اس سے تو دن کے خسارے بھی نہیں نکلیں گے

تم بھی غالبؔ کی طرح لاکھ جتن کر لو شکیلؔ
سارے ارمان تمہارے بھی نہیں نکلیں گے

سچ وہ قطرہ، جو گہر ہو ہی نہیں سکتا تھا
اس کمائی سے تو گھر ہو ہی نہیں سکتا تھا

وہ تو تم آب و ہوا لائے کہ آباد ہوا
اس خرابے میں نگر ہو ہی نہیں سکتا تھا

یہ ترے لمس کی گرمی ہے جو ہم چل نکلے
ایسی سردی میں سفر ہو ہی نہیں سکتا تھا

موم سے میرا تعلق تھا ترا شعلوں سے
اپنا اک ساتھ گزر ہو ہی نہیں سکتا تھا

اُس طرف لوگ گنہگار بھی تھے، اپنے بھی
میں کسی طرح اُدھر ہو ہی نہیں سکتا تھا

شاہ کو اس کے پیادوں سے لڑایا میں نے
ورنہ یہ معرکہ سر ہو ہی نہیں سکتا تھا

سلسلہ میرا تھا سورج کے گھرانے سے شکیلؔ
مجھ پہ آندھی کا اثر ہو ہی نہیں سکتا تھا

❖

دل سے جو جاتا ہے، تھوڑا بھی نہیں رکتا ہے
اینٹ کیا پانی پہ روڑا بھی نہیں رکتا ہے

اپنی ہی شکل میں رہنے پہ بضد ہے لوہا
دیکھیے کیا ہو ہتھوڑا بھی نہیں رکتا ہے

روز لگتا ہے مرے جسم پہ نشتر کوئی
اور بڑھتا ہوا پھوڑا بھی نہیں رکتا ہے

جانے کس جرم کی تعذیر ملی ہے مجھ کو
جاں نکلتی نہیں کوڑا بھی نہیں رکتا ہے

راستہ ہے کہ پکارے ہی چلا جاتا ہے
میں بھی تھکتا نہیں گھوڑا بھی نہیں رکتا ہے

غرق ہوتا ہے کنارہ تو سفینے ہی نہیں
پنچھیوں کا کوئی جوڑا بھی نہیں رکتا ہے

❖

عجیب منظر ہے بارشوں کا مکان پانی میں بہہ رہا ہے
فلک زمیں کی حدود میں ہے نشان پانی میں بہہ رہا ہے

تمام فصلیں اُجڑ چکی ہیں نہ ہل بچا ہے نہ بیل باقی
کسان گروی رکھا ہوا ہے لگان پانی میں بہہ رہا ہے

عذاب اُترا تو پاؤں سب کے زمیں کی سطحوں سے آلگے ہیں
ہوا کے گھر میں نہیں ہے کوئی مچان پانی میں بہہ رہا ہے

کوئی کسی کو نہیں بچاتا سب اپنی خاطر ہی تیرتے ہیں
یہ دن قیامت کا دن ہو جیسے جہان پانی میں بہہ رہا ہے

اُداس آنکھوں کے بادلوں نے دلوں کے گرد و غبار دھوئے
یقین پتھر بنا کھڑا ہے گمان پانی میں بہہ رہا ہے

تیرگی ہر زاویے پر ہے ابھی
صبح کتنے فاصلے پر ہے ابھی

اس کو گزرے اک زمانہ ہو گیا
روشنی سی راستے پر ہے ابھی

چار آنکھیں منظروں میں کھو گئیں
ایک چہرہ دیکھنے پر ہے ابھی

فیصلے میں اس قدر جلدی نہ کر
گرد سی اِک آئینے پر ہے ابھی

رائگاں مت جان پہلا تجربہ
ہاتھ میرا دوسرے پر ہے ابھی

❖

صلہ خوبی کا خامی سے ملا ہے
وہ ہم سے بدکلامی سے ملا ہے

جسے ہم جان و دل میں رکھ رہے تھے
وہ سالا بھی حرامی سے ملا ہے

سکوں بھی چھین لینا چاہتے ہو
یہی تو نیک نامی سے ملا ہے

یہ جذبہ جو بغاوت کا ہے خوں میں
ہمیں یہ بھی غلامی سے ملا ہے

جسے تم اپنا کہتے ہو وہ بچہ
مزاروں کی سلامی سے ملا ہے

ہمیں کب ہل چلانا آرہا تھا
یہ غلہ تو اسامی سے ملا ہے

بہت کچھ چھوڑ کر آگے بڑھا ہوں
بہت کچھ تیز گامی سے ملا ہے

❖

چراغ بن کے ہواؤں کی میزبانی کی
زمین ہم نے بہت تیری پاسبانی کی

چکانی پڑتی ہیں اور وہ بھی روز قسطوں میں
عجیب قیمتیں ہوتی ہیں مہربانی کی

تمہارے درد سے لے کر ہمارے آنسو تک
بڑی طویل کہانی ہے آگ پانی کی

تمام رشتوں میں اک گانٹھ پڑتی جاتی ہے
ہوائیں چلتی ہیں ذہنوں میں بدگمانی کی

فضا خراب ہے لیکن بہت خراب نہیں
بس اک ذرا سی ضرورت ہے ساؤدھانی کی

جو ڈور میں بھی نہیں تھے انہی پتنگوں نے
ہوا ملی تو بہت بات آسمانی کی

❖

تلاشِ دانہ پانی چل رہی ہے
وہی کھیتی کسانی چل رہی ہے

وہی دربدری کے دن ہیں ہمارے
وہی نقلِ مکانی چل رہی ہے

وہی تنہائی کا عالم وہی ہم
وہی پُروا سہانی چل رہی ہے

اپاہج ہو گئے کردار سارے
کسی صورت کہانی چل رہی ہے

دشائیں کھو گئی ہیں منزلوں کی
بڑی بے اطمنانی چل رہی ہے

ملائے جا رہے ہیں ہاتھ لیکن
دلوں میں بدگمانی چل رہی ہے

ابھی مانی کہاں ہے بات اس نے
ابھی تو آنا کانی چل رہی ہے

❖

ہاتھ پکڑ کر اندر تک لے جاتے ہیں
کچھ منظر پس منظر تک لے جاتے ہیں

ہم کو دیواروں سے کوئی پیار نہیں
کچھ بچے ہیں جو گھر تک لے جاتے ہیں

روز ارادہ کرتے ہیں مر جانے کا
روز گلے کو خنجر تک لے جاتے ہیں

چڑھنے والو زینوں کی تعظیم کرو
زینے ہی تو اوپر تک لے جاتے ہیں

بجھ جاتے ہیں ہم بھی سورج کے ہمراہ
راکھ اُٹھا کر بستر تک لے جاتے ہیں

یا دفتر کو لے آتے ہیں گھر کے پاس
یا گھر کو ہی دفتر تک لے جاتے ہیں

ایک پرندہ ہے جو اُڑتا رہتا ہے
لوگ نشانے شہپر تک لے جاتے ہیں

❖

اشک کس کا ہے جو پُر جوش ہوا جاتا ہے
شہر کا شہر زمیں دوش ہوا جاتا ہے

صرف باتوں سے ہی میں کتنا بھرم رکھوں گا
سامنے آ کہ مجھے ہوش ہوا جاتا ہے

ایک کہرا ہے جو چھایا ہے سبھی آنکھوں پر
ایک منظر ہے جو روپوش ہوا جاتا ہے

اب کوئی چیز نہیں چبھتی مرے تلوے میں
پاؤں ہی پاؤں کا پاپوش ہوا جاتا ہے

کس طرح بھرتے ہوئے زخم کو تازہ رکھوں
سارا قصہ ہی فراموش ہوا جاتا ہے

اتنی چھلکائی ہے محفل میں گلابی اس نے
جو بھی آتا ہے وہ مدہوش ہوا جاتا ہے

ہم سے میکش کہاں بیٹھیں ترے میخانے میں
ہر شرابی ہی بلانوش ہوا جاتا ہے

کچھ تو رفتار بھی کچھوے کی طرح ہے اپنی
اور کچھ وقت بھی خرگوش ہوا جاتا ہے

در و دیوار لیے بیٹھے ہیں کس کی باتیں
ہر دریچہ ہمہ تن گوش ہوا جاتا ہے

سونے والے! ہمیں قصہ تو سناتے پورا
یار ایسے کہیں خاموش ہوا جاتا ہے

دل میں رکھتے ہیں خزانے کی تمنا لیکن
پہلے دریا سے ہم آغوش ہوا جاتا ہے

❖

میں جانتا ہوں خوشامد پسند کتنا ہے
یہ آسمان زمیں سے بلند کتنا ہے

تمام رسم اُٹھا لی گئی محبّت میں
دِلوں کے بیچ مگر قید و بند کتنا ہے

جو دیکھتا ہے وہی بولتا ہے لوگوں سے
یہ آئینہ بھی حقیقت پسند کتنا ہے

تمام رات مرے ساتھ جاگتا ہے کوئی
وہ اجنبی ہے مگر دردمند کتنا ہے

میں اس کے بارے میں اکثر یہ سوچتا ہوں شکیلؔ
کھلا ہوا ہے وہ اتنا تو بند کتنا ہے

❖

خدایا خیر کہ پھر بستیاں زدوں پر ہیں
طویل جنگ کے آثار سرحدوں پر ہیں

گذشتہ جنگ میں غداریاں تھیں جن کے نام
عجب کہ سر بھی سلامت انھی قدوں پر ہیں

میں سنگ باری کے موسم سے بچ کے کیا کرتا
مزے لہو کے تو زخموں کی آمدوں پر ہیں

نئے دماغ ہیں تابع قدیم فکروں کے
عقیدتوں کے وہی رنگ برگدوں پر ہیں

ردائے شام کے پیچھے چھپا ہوا ہے کوئی
عجیب خوف یہ سورج کے شبکدوں پر ہیں

❖

کسی کے واسطے تڑپا نہ بے قرار رہا
ہر اِک جگہ مجھے اپنا ہی انتظار رہا

بچھڑ کے بھی وہ مرے ساتھ ہی رہا اکثر
سفر کے بعد بھی میں ریل میں سوار رہا

وہ سانحہ تو بظاہر گزر گیا تھا مگر
فضائے دل میں بہت دیر تک غبار رہا

خوشی تو پہلے بھی ہوتی تھی عارضی لیکن
ہمارے دور میں غم بھی نہ پائیدار رہا

زمیں پہ آیا تھا سورج کا ایلچی بن کر
تمام دن میں اندھیروں کے آر پار رہا

بچا ہے کون بھلا اس جہانِ فانی میں
نہ میں رہا نہ مرا کوئی شاہکار رہا

ہم آگئے تھے یونہی میرؔ کی گلی میں شکیلؔ
مگر یہاں بھی وہی اپنا کاروبار رہا

❖

اب نہ وہ پاؤں ہیں نہ ہاتھ مرے
کٹ گئے سارے جنگلات مرے

بجھ گئے سب مرے ہنر کے چراغ
مٹ گئے سب عجائبات مرے

کل یہ دنیا تھی میری پرچھائیں
آج کوئی نہیں ہے ساتھ مرے

آ گیا کاروبارِ دنیا جب
بک گئے سب تخیلات مرے

اتنے صدمے اُٹھا چکا ہوں میں
منہ سے آتی نہیں ہے بات مرے

یوں نظر تیرے پھیر لینے سے
کم نہ ہوں گے مطالبات مرے

میری شاموں کو بھی جگنو سے سجائے کوئی
خود نہ آئے نہ سہی یاد تو آئے کوئی

رات بھر جلتا رہا ہوں میں چراغوں کی طرح
صبح ہونے کو ہے اب مجھ کو بجھائے کوئی

ڈھونڈتا ہوں میں بہانہ کوئی رونے کے لیے
چاہتا ہوں کہ مرے دل کو دکھائے کوئی

اپنے ہی آپ سے روٹھا ہوں کسی بات پہ میں
مجھ کو میری ہی طرح آکے منائے کوئی

جانے کیوں آج شرابوں سے نشہ ہوتا نہیں
بھر کے اک جام مجھے زہر پلائے کوئی

اک ذرا راہ سے بھٹکا تو بھٹکتا ہی گیا
کھو گیا ہوں میں کہیں ڈھونڈ کے لائے کوئی

اب تو میں اپنے گناہوں کی سزا کاٹ چکا
اب تو آکر مجھے سینے سے لگائے کوئی

❖

آگ دل کو لگے آنکھوں کو دھواں لے جائے
غم بچھڑنے کا ہمیں جانے کہاں لے جائے

ایک ٹوٹے ہوئے پتّے کی طرح ہیں، ہم بھی
اب ہوا چاہے جہاں ہم کو وہاں لے جائے

ہم ترے دکھ کو اُٹھائے ہوئے یوں پھرتے ہیں
جیسے کاندھے پہ کوئی اپنا مکاں لے جائے

ہم جو ڈوبیں تو کنارے سے نہ دیکھے کوئی
اور کچھ دور ہمیں آبِ رواں لے جائے

کوئی چہرہ ہے نظر میں نہ کوئی منزل ہے
بس چلے جائیں گے یہ راہ جہاں لے جائے

جانے کس وقت بدل جائے بہاروں کا سماں
اور مہکے ہوئے پھولوں کو خزاں لے جائے

جس طرف جائیے سیلاب زدہ ہے دنیا
کوئی رکھنے کو کہاں اپنا مکاں لے جائے

❖

طویل ہجر ہے اک مختصر وصال کے بعد
میں اور ہو گیا تنہا ترے خیال کے بعد

تپش اک اور ہے دن کی حرارتوں کے سوا
سفر اک اور ہے سورج ترے زوال کے بعد

کسی سے رکھتے کہاں دشمنی کا رشتہ ہم
لہو کو سرد بھی ہونا تھا اک اُبال کے بعد

جو توڑنا ہے تو دل اس ادا سے توڑ مرا
کوئی ملال نہ ہو مجھ کو اس ملال کے بعد

ذرا بھی سوچ نہ پایا میں اپنے بارے میں
کوئی خیال نہ آیا ترے خیال کے بعد

کہاں گئی وہ محبت کہ جس کے سائے میں
لپٹ کے روئے تھے ہم دونوں عرضِ حال کے بعد

یہ دل کی بات ہے سوداگری نہیں یارو
کسی نے کی ہے محبّت بھی دیکھ بھال کے بعد

شکیلؔ بند ہوا ہم پہ اس کا دروازہ
کبھی سوال سے پہلے کبھی سوال کے بعد

❖

جان سے پیارے روٹھ گئے
یار ہمارے روٹھ گئے

نظروں نے گستاخی کی
اور نظارے روٹھ گئے

دریا میں جو اُترے ہم
ہم سے کنارے روٹھ گئے

تنہا ہے بوڑھا آکاش
چاند، ستارے روٹھ گئے

سونے سے اب کیا حاصل
خواب تو سارے روٹھ گئے

اگر وہ مجھ سے بڑا ہے تو اپنے قد میں رہے
میں اپنی حد میں رہوں وہ بھی اپنی حد میں رہے

خلا میں بھی ہو دھماکہ کبھی کبھار کوئی
کبھی کبھار فلک بھی زمیں کی زد میں رہے

اک ایسا وقت پڑا تھا ہماری بستی پر
کہ ہم مکان میں ہوتے ہوئے لحد میں رہے

ہمارے جسم نے کل رات ہم سے پوچھا تھا
ہم اتنے روز کہاں، کس کے خال و خد میں رہے

ترے وصال کی محرومیاں سمیٹے ہوئے
ہماری طرح کوئی شہرِ نابلد میں رہے

زمانہ جلد کوئی فیصلہ نہیں کرتا
بہت دنوں یہاں ہم بھی قبول و رد میں رہے

پلٹ کے آئیں بزرگوں کے دائرے میں کبھی
کچھ امتیاز ہمیں بھی تو نیک و بد میں رہے

نکل کے کوئی نہ آیا مرے برابر تک
سب اپنی آن لیے اپنے اپنے قد میں رہے

❖

ستارے ٹوٹنے دیتا نہیں ہے
فلک لب کھولنے دیتا نہیں ہے

لگی ہے بھیڑ اک منظر کے پیچھے
سو کوئی دیکھنے دیتا نہیں ہے

سمیٹے جا رہا ہے پاؤں جاڑا
زرا بھی پھیلنے دیتا نہیں ہے

وہ مجھ سے چاہتا ہے مشورے بھی
مگر کچھ بولنے دیتا نہیں ہے

بسا ہے ذہن و دل میں اس طرح وہ
مجھے کچھ سوچنے دیتا نہیں ہے

## شہر میں جنگل

بس کی کھڑکی سے
تھوکتے ہیں ہم
اور آتا ہے تھوک
ہم پر ہی
چلتے ہوتے ہیں
ہم ہی سڑکوں پر

اپنی ہی ماں کی
اور بہنوں کی
خود ہی دیتے ہیں گالیاں خود کو
آپ ہی آپ سے جھگڑتے ہیں
آدمیت کا خون کرتے ہیں
آدمی کا لہو
ہمارا لہو
ہم کہ اپنے لہو کے پیاسے ہیں
جانور
اب بھی ہم پہ حاوی ہے
ہم ابھی جنگلوں میں رہتے ہیں

## جانور

کسانوں کی ہری فصلیں
غذائیں نیل گایوں کی
کسانوں کے گھروں میں
بھوک پلتی ہے
ابھی بھی کتنے گھر ہیں گاؤں میں ایسے
جہاں دو وقت کی روٹی
بڑی مشکل سے ملتی ہے
درندے
بستیوں میں گھس کے
بچوں کو اُٹھالے جاتے ہیں جنگل میں
ان کو پھاڑ کھاتے ہیں

مگر ہم ان کا کچھ بھی کر نہیں سکتے
ہمارے ہاتھ تو قانون نے باندھے ہوئے ہیں
ہمارے ملک میں
انسان کی عزت
تحفظ
کچھ نہیں ہے
بہت آسان ہے انسان پر گولی چلا دینا
لہو اس کا بہا دینا
مگر مشکل بہت ہے
جانور کا قتل کرنا
اور بچ جانا
یہاں پر جانور کا مان ہے
سمان ہے
کہیں یہ ماں کہیں بھگوان ہے
سیاست کا بڑا میدان ہے

## جنگل کا آدمی

آکاش رہا چھپر میرا
یہ دھرتی تھی بستر میرا
سورج کو خدا بنایا تھا
اک نور اسی سے پایا تھا
پتھر سے آگ جلائی تھی
لکڑی سے ناؤ بنائی تھی
سر پر دو سینگ سنوارے تھے
تیروں سے درندے مارے تھے

پوشاک بنی تھی پتّوں سے
رشتہ تھا عجب درختوں سے
پھل سارے مری غذائیں تھے
گل بوٹے مری دوائیں تھے
گرمی سے تن کو ڈھانپا تھا
سردی کو جلا کر تاپا تھا
بادل برسے تو بھیگ گیا
جب دھوپ کھلی تو سوکھ گیا
میں چھتری کے بن چلتا تھا
موسم کے ساتھ بدلتا تھا
جب میں جنگل میں رہتا تھا

## روشنی کا سفر

شام کا ہلکا سا دھندلکا ہے
ایک لڑکی سیاہ اسکرٹ میں
اپنی مستی میں چلتی جاتی ہے
پنڈلیوں میں چراغ جلتے ہیں
ایک لڑکا اسی اجالے میں
اپنی منزل کے خواب دیکھتا ہے

# باہر کی لڑکی

گھر سے
باہر کی
ہو جانے والی لڑکی
کال گرل بن جاتی ہے
یا پھر دل بہلاتی ہے
دفتر میں ان لوگوں کا
جو عہدے میں اس سے بڑے ہیں
اس کے سود و زیاں سے جڑے ہیں
انہی بڑے لوگوں میں رہ کر
وہ بھی
سگرٹ
اور بیئر کا
اک دن حصہ بن جاتی ہے
کوئی قصہ بن جاتی ہے

## میں ہندوستانی ہوں

مجھے
اپنے وطن سے
کس قدر اپنائیت ہے
عشق ہے
میں کہہ نہیں سکتا
بس اتنا جانتا ہوں
اس سے کٹ کر رہ نہیں سکتا
یہاں کی خاک
میرے جسم کی مٹی میں شامل ہے
پہاڑوں کی بلندی سے جڑی ہے میری اونچائی

درختوں کے تنے ہیں پاؤں میرے
ہاتھ ہیں شاخیں
ندی
جھرنے
سمندر
میرے تن میں خون کی مانند
مرے اندر وطن میرا
مرے باہر وطن میرا
میں ذرّے ذرّے پہ لکھی وفاؤں کی کہانی ہوں
میں اک ہندوستانی ہوں

## سیلاب

ندیاں چھلکتی ہیں
اپنا پیٹ بھرتی ہیں
لہلہاتے کھیتوں سے
کھلکھلاتے گاؤں سے
جگمگاتے شہروں سے
لوگ بھوکے مرتے ہیں

# اندر سے باہر تک

کئی دنوں سے
کوئی نام
کوئی چہرہ
کوئی جسم
کوئی رسالہ
کوئی کتاب
دل کے بہلنے کی صورت
کوئی چیز نہیں بنتی
گلیاں، کوچے اور بازار
لائبریری
سینما ہال
سب اُجڑے سے لگتے ہیں
جانے ایسا کیوں لگتا ہے

## سردی کی صبح

صبح سو کے اٹھو تو
سرد سرد ہونٹوں پر
کپ پلیٹ بجتے ہیں
اور چائے کی خواہش
ہوٹلوں میں پھرتی ہے

# گرمی کی دوپہر

آگ سے بھرا سورج
جسم میں اترتا ہے
خون چوس لیتا ہے
ہونٹ سوکھ جاتے ہیں
آب آب کرتے ہیں
دھول اُڑتی رہتی ہے

## بارش کی رات

بارش کے ہونے سے پہلے
یا بارش ہو جانے پر
کالے گھور اندھیروں میں
جگنو جگمگ کرتے ہیں
نیند اُڑا لے جاتے ہیں
لیکن جب بارش ہوتی ہے
پیڑوں کے پتّے بجتے ہیں
بوندوں کی رِم جھم آواز یں
رقاصہ کی پازیبوں سی لگتی ہیں

چھت سے آنگن تک کا سماں
رقص میں ڈوبا لگتا ہے
کمرے کی دیواروں سے
سُر اور تال نکلتے ہیں
پورا گھر موسیقی سے بھر جاتا ہے
ذہن پہ جیسے ایک نشہ سا ہو جاتا ہے
ہلکا سا
بیئر کے جیسا
آنکھیں بند کرو تو نیند آجاتی ہے

## مٹی کا دُکھ

نا مٹی سے
نا موسم سے رشتے ہیں
سردی
گرمی
بارش
سب اک جیسے ہیں
کچّے رستے
ننگے پاؤں پہ روتے تھے
اب پیروں میں
جوتا پہنے
سب پتھر پر چلتے ہیں

کھیتوں میں بھٹے بوتے ہیں
دھرتی کا دل جلتا ہے
اینٹیں بنتی ہیں
روزانہ شاداب زمیں کی
کچھ زرخیز تہیں کٹتی ہیں

ریزہ

ریزہ
مٹی ہونے والے پربت
اپنی قربانی پر بیٹھے روتے ہیں
مٹی ہی مٹی کو زخمی کرتی ہے

# سفید کپڑے

سفید کپڑے
بدن پہ کھلتے ہیں
اور خوشبو بکھیرتے ہیں
مگر یہ خوشبو بناوٹی ہے

یہ وہ بدن ہیں
کہ جن کے رشتے
زمیں کی سطحوں سے کٹ چکے ہیں
تم اپنے ہاتھوں کو

اپنے پیروں کو
اپنی مٹی سے جوڑے رکھو
سفید کپڑوں کا شوق چھوڑو

## ڈر

شوروموں سے
ڈرنے والے
اچھے لوگو!
فٹ پاتھوں پر بکنے والی
ساری چیزیں
مہنگی بھی ہیں
گھٹیا بھی ہیں
یہ جو دل میں ڈر ہے
اس کو پتھر کرلو
اس پتھر سے شوروموں کے شیشے توڑو
رنگ برنگی ساری خوشیاں گھر لے آؤ
ان خوشیوں کے رنگ بڑے پکے ہوتے ہیں
یہ بھیگی آنکھوں سے بھی ہنستے رہتے ہیں

# مایوسی

آسماں پر
نہ کوئی چاند
نہ تارہ ہے کوئی
ہر دِشا گم ہے
مرے پاؤں کی سمتوں کی طرح
جس طرف جاتا ہوں
مایوسی ہی مایوسی ہے
اس اندھیرے میں
اِک اُمید کا جگنو بھی نہیں

اے خدا!
میں ترے ہونے سے ہی
زندہ ہوں
مگر
آج کی رات یہ لگتا ہے جیسے تو بھی نہیں
تو اگر ہے تو دکھائی دے کہیں سے مجھ کو
آسماں صاف نظر آئے زمیں سے مجھ کو

## آدھا چاند

رات لمبی ہے
چاند آدھا ہے
نیند آئے تو کس طرح آئے
زندگی کم ہے
کام زیادہ ہے

# زلزلہ

تو کیا سمجھتا ہے
تو ظلم کو مٹا دے گا
گناہگار
گناہوں سے باز آئیں گے
اگر تو ایسا سمجھتا ہے تو سمجھتا رہ
زمیں تلے انھی خوش فہمیوں میں جیتا رہ
تری تباہی سے
انسان ڈرنے والا نہیں
ذرا سے جھٹکے سے کمبخت مرنے والا نہیں
جہاں پہ تو نے گرائے تھے کچھ مکان، وہاں
بلند اور بھی لوگوں نے چھت بنائی ہے
وہی سماج میں پھیلی ہوئی برائی ہے
اب آنا ہو تو قیامت کے روپ میں آنا
فلک کو ساتھ لئے تیز دھوپ میں آنا

## پس منظر کی تلاش

میں
درختوں
پہاڑوں سے
ہوتا ہوا
جستجو میں تری
آسمانوں کو چھو کر پلٹ آیا ہوں
تو کہاں ہے
ذرا مجھ کو آواز دے

# چاہت کے پھول

خواب میں اک حسین لڑکی نے
پیار سے اک قلم دیا مجھ کو
اور کہا کہ میں اس کا نام لکھوں
اس کو قدرت کا شاہکار لکھوں
صبح اٹھا تو میری آنکھوں میں
اس کی چاہت کے پھول روشن تھے
اور خوشبو بدن میں پھیلی تھی

# مٹی میں آسمان

وہ جہاں، جس میں تم تھے اور میں تھا
جس کو ہم نے بہت سجایا تھا
جس میں ہم نے رچی تھی اک دھرتی
اور اِک آسماں بنایا تھا
ایک چھوٹی سی بات پر کیسے
اشک بن کر وہ آیا پلکوں پر
اور پلکوں پہ آکے ٹوٹ گیا
کھو گیا وہ جہان مٹی میں
مل گیا آسمان مٹی میں

❖

چمکتا چاند، مہکتی کلی محبت ہے
کسی بھی شکل میں ہو زندگی محبت ہے

خدا کا نام لکھا ہے تمام چہروں پر
مرے لئے تو ہر اک آدمی محبت ہے

چراغ راہ میں ہو یا گلاب ٹہنی پر
ہوا سے لڑتی ہوئی روشنی محبت ہے

یہ جو غبار ہے دیوانگی ہے صحرا کی
پہاڑ کاٹ کے بہتی ندی محبت ہے

ٹھہریئے مت کہ بڑی دشمنی ہے منزل پر
بھٹکتے رہیے کہ آوارگی محبت ہے

لہو کا آنکھ میں آنا کوئی مذاق نہیں
جو رو رہے ہیں انھیں واقعی محبت ہے

سنائی دیتی ہے لفظوں میں دل کی دھڑکن بھی
زمانے والو! مری شاعری محبت ہے

یہ قہقہہ جو اُڑا جا رہا ہے ہونٹوں سے
ٹھہر گیا تو یہی دل لگی محبت ہے

❖

اشک چمکے گا، نظارے تو نہیں چمکیں گے
موج کی طرح کنارے تو نہیں چمکیں گے

اس نئی رسم کے پیچھے کوئی سازش ہوگی
جیتنے والوں میں ہارے تو نہیں چمکیں گے

شعر ہوں میرے یا کردار ترے قصوں کے
کچھ چمک جائیں گے سارے تو نہیں چمکیں گے

روشنی کے لیے آکاش پہ جانا ہوگا
گھر کی دہلیز پہ تارے تو نہیں چمکیں گے

راہ کی دھول کو گرماتے رہو قدموں سے
یونہی منزل کے شرارے تو نہیں چمکیں گے

چاند آیا ہے تمہارے لیے واپس نہ کرو
روز قسمت کے ستارے تو نہیں چمکیں گے

جس طرح ہنستے ہوئے ہم نظر آتے ہیں تجھے
اس طرح درد کے مارے تو نہیں چمکیں گے

❖

غزل کے فن کو ذرا غیر رسمی کرتے ہیں
ہم اس گلاب سے پتھر کو زخمی کرتے ہیں

ہمارے حصے میں آیا ہے سردیوں کا سفر
ہم اپنے قدموں تلے جل کے گرمی کرتے ہیں

خدا کو ڈھونڈتے رہتے ہیں روح میں اپنی
ہم اپنے آپ کو اندر سے دھرمی کرتے ہیں

گواہ کوئی بناتا نہیں ابھی ہم کو
سو ہم بھی دیکھ کے سب طوطا چشمی کرتے ہیں

دراصل اور بھی کچھ سخت ہونا ہے ہم کو
اسی لیے تو طبیعت میں نرمی کرتے ہیں

کسا ہوا ہے بہت جسم شیروانی میں
اُٹھا کے نظم کسی دن بے نظمی کرتے ہیں

بلا کا حسن ہے سب دیکھتے ہیں مڑ کے شکیلؔ
انھی بے شرموں میں ہم بھی بے شرمی کرتے ہیں

❖

چادر کو تہہ سے کھولو، پھیلاؤ بھی
خود کو ننگا دیکھو تو شرماؤ بھی

اندازہ ہو کچھ تو اپنے ہونے کا
تاریکی میں جاؤ تو گھبراؤ بھی

جھوٹ جھوٹ میں اک دن کوئی سچ بولو
کھلتے کھلتے کوئی دن مرجھاؤ بھی

پھینک دیئے جاؤ گے ورنہ گملے سے
پھولے ہو تو آنگن کو مہکاؤ بھی

کھیتوں سے بس باتیں کرتے رہتے ہو
بادل ہو تو کچھ پانی برساؤ بھی

ہوا بنے پھرتے ہو میرے رستے میں
کنگھی بن کر بالوں کو سلجھاؤ بھی

خود کو تم محتاط بہت رکھتے ہو یار
غلطی کر کے کوئی دن پچھتاؤ بھی

❖

اثر بیجوں کا ہی پودوں کے رنگ و بو میں ہوتا ہے
وفا کا مادہ کب سانپ اور بچھو میں ہوتا ہے

کسی کا نرم لہجہ گفتگو سے زخم تک پہنچا
یہ سوچا ہی نہیں تھا زہر بھی خوشبو میں ہوتا ہے

خدا جانے یہاں پر کس طرح کے لوگ رہتے ہیں
تماشہ اک نیا ہر دن مرے بازو میں ہوتا ہے

اثاثہ جتنا ہے دل کا بہا جاتا ہے آنکھوں سے
میں جب روتا ہوں تو سارا جہاں آنسو میں ہوتا ہے

نتیجہ کچھ بھی ہو لڑتا تو ہے شب بھر اندھیروں سے
بلا کا حوصلہ چھوٹے سے اک جگنو میں ہوتا ہے

یہی ہے وہ شرابوں سے جو اپنے ہاتھ دھوتا تھا
یہی ہے وہ جو اب ہر وقت اللہ ہو میں ہوتا ہے

میں خود سے بے خبر تیری طرف کو دوڑ پڑتا ہوں
مرا سب کچھ تری آواز کے جادو میں ہوتا ہے

اور کچھ درد مرے درد میں شامل کر دے
میرے سینے میں جو پتھر ہے اسے دل کر دے

مطمئن ہونے لگا ہوں میں سفر سے اپنے
کوئی دیوار مری راہ میں حائل کر دے

سرد پڑ جائے نہ احساس کی شدت کا الاؤ
دل میں جو غم ہے اسے روح میں داخل کر دے

میں اسے ڈھونڈنے نکلوں تو نکل جاؤں کہیں
مجھ کو آوارہ مسافر اسے منزل کر دے

وہ مجھے مجھ سے ملائے بھی اگر کھو جاؤں
اور مل جاؤں تو پھر سے مجھے غافل کر دے

دل یہ کہتا ہے کہ موجوں سے اُلجھ کر ٹوٹوں
اس کو بہتا ہوا دریا مجھے ساحل کر دے

سچ مرا لے کے مری جان کے بدلے میں شکیلؔ
جانے کس روز یہ دنیا مجھے باطل کر دے

❖

کسی بھی طرح نہیں تم کو بھولنے کا ہے
ذرا سا دل ہے مگر کتنا بے کہے کا ہے

وہ لہر آتی ہے جاتی ہے ایک لمحے میں
پھر اس کے بعد ہے جو کچھ وہ سوچنے کا ہے

بچانے والا بھی کوئی نہیں کنارے پر
ندی کے ساتھ یہی وقت ڈوبنے کا ہے

تمھاری آنکھوں میں ٹھہرا ہوا ہے جو منظر
نیا نہیں ہے مگر پھر بھی دیکھنے کا ہے

بہت قریب سے ہر بار دیکھتا ہوں اسے
مگر سوال وہی تھوڑے فاصلے کا ہے

گذشتہ رات ذرا سا جو ہم میں باقی تھا
یہیں کہیں پہ وہ رشتہ بھی ٹوٹنے کا ہے

بہت سنبھل کے نہ چلیے کہ حادثہ ہی نہ ہو
شکیلؔ گرنا بھی دستور راستے کا ہے

کچھ تو ہم میں نئے ہونے کے بہانے ہوتے
تم بدلتے تو ذرا ہم بھی پرانے ہوتے

سوچو کیا ہوتا کسی جنگ کے میداں میں اگر
ہم کو تلوار تمہیں تیر چلانے ہوتے

آسماں صرف ستارہ ہی ہمیں جانتا ہے
خاک میں ہوتے اگر ہم تو خزانے ہوتے

ہم کسی زلف میں ٹھہرے ہی نہیں دیر تلک
ٹھہر جاتے تو بڑے ناز اُٹھانے ہوتے

وہ جو نظریں دلِ بیمار کے کام آتی ہیں
کاش ہم بھی انھی نظروں کے نشانے ہوتے

خالی خالی سی جو رہتی ہیں، انھی آنکھوں میں
چاہتے تم تو محبت کے فسانے ہوتے

کر دیا ہوتا حوالے جو ہوا کے تم نے
کتنے موسم اسی آنچل میں سہانے ہوتے

کھل گئے پہلی نظر ہی میں ترے سارے فریب
ورنہ ہم بھی تری آنکھوں کے دِوانے ہوتے

آگئی نیند، ہوا ختم جو تاروں کا شمار
اب نہ سوتے تو ستارے بھی بنانے ہوتے

ہو کے بے ٹھور ٹھکانہ بڑے آرام سے ہیں
گھر کے ہو جاتے تو پیسے بھی کمانے ہوتے

❖

پلٹ کے دیکھا تو میں تھا نہ میرا سایہ تھا
کسی نے مجھ کو بہت دور سے بلایا تھا

یہی فلک ہے کہ جس پر کبھی ہمارے لیے
تمام رات کوئی چاند جگمگایا تھا

تمام رات میں تنہا رہا، اداس رہا
بس اتنی بات تھی تیرا خیال آیا تھا

اسی کو سوچ کے روئی ہیں بارہا آنکھیں
اسی کو دیکھ کے اک بار مسکرایا تھا

یہ غم نکلتا نہیں میرے جان و دل سے بھی
جسے میں اپنا سمجھتا تھا وہ پرایا تھا

بھرم بھی رکھ نہ سکا میری سادگی کا وہ
میں جان بوجھ کے جس سے فریب کھایا تھا

ملے تھے گھر کے دریچے بھی سازشوں میں شکیلؔ
ہوا نے میرے چراغوں کو جب بجھایا تھا

❖

تیری فرقت مری تقدیر نہیں تھی پہلے
میرے کمرے میں یہ تصویر نہیں تھی پہلے

دل دھڑکتا تھا مگر تیری صداؤں کے بغیر
درد پہلے بھی تھا تاثیر نہیں تھی پہلے

تجھ سے بچھڑا تو مجھے پیار کیا دنیا نے
یہ محبت مری جاگیر نہیں تھی پہلے

ہم سے پہلے بھی غزل والے بہت روئے مگر
اتنی سنگین یہ تعزیر نہیں تھی پہلے

جانے کس طرح محبت کے پیام آتے تھے
کوئی کاغذ کوئی تحریر نہیں تھی پہلے

عمر کچی تھی تو نیندیں بھی مزہ دیتی تھیں
زندگی خواب کی تعبیر نہیں تھی پہلے

کتنی آزادی سے ہم گھومتے پھرتے تھے شکیلؔ
کوئی دیوار یا زنجیر نہیں تھی پہلے

کتابِ عشق میں لکھے سخن جدید ہیں ہم
ہمیں پڑھو کہ تمھارے لیے مفید ہیں ہم

بھٹک رہے ہیں کوئی آگ لے کے سینے میں
نہ جانے کس کے لیے اس قدر شدید ہیں ہم

قبولیات کی سب رسمیں ہم پہ ختم ہوئیں
کہ خود ہی پیر ہیں اور اپنے ہی مرید ہیں ہم

ہر ایک رات ہمیں آسماں پہ مت ڈھونڈو
کبھی کبھار نکلتے ہیں ماہِ عید ہیں ہم

تمام رات تجھے ہم نے جاگ کر دیکھا
ترے گواہ ہیں اور وہ بھی چشم دید ہیں ہم

اے زندگی ترا ہر حکم ہے سر آنکھوں پر
ترے غلام ہیں اور وہ بھی زر خرید ہیں ہم

یہ کارِ چشم ادھورا ہے کہ ابھی ہم کو
جو تم نے سمجھا ہے کچھ اس سے بھی مزید ہیں ہم

❖

بجھ چکا ہوں، کریدتا کیا ہے
اب مری راکھ میں دھرا کیا ہے

رات بھر ایک لالٹین لیے
چاند گلیوں میں ڈھونڈتا کیا ہے

ایک زنجیر ہے عذابوں کی
اور ماضی کا سلسلہ کیا ہے

یہ ترا قسط وار غم تو نہیں
میری پلکوں سے ٹوٹتا کیا ہے

کب تلک عکس رکھ سکے گا مرا
میں نہیں ہوں تو آئینہ کیا ہے

جا رہا ہے تو اب چلا ہی جا
اتنا رک رک کے سوچتا کیا ہے

لوگ سڑکوں پہ آگئے ہیں شکیلؔ
کچھ ہوا ہے مگر ہوا کیا ہے

❖

کسی کو اپنا بنا لو، کسی کے ہو جاؤ
کہ زندگی ہے یہی زندگی کے ہو جاؤ

وصال ہو کہ جدائی، وفا ضروری ہے
بس ایک عشق کرو اور اسی کے ہو جاؤ

تم آسمان میں پھرتے ہو چاند بن کے کہاں
زمیں پہ آؤ مری شاعری کے ہو جاؤ

میں منزلوں سے نکل کر بھٹکنا چاہتا ہوں
اے راستو! مری آوارگی کے ہو جاؤ

مرے گناہ! مرے ساتھ آؤ مسجد میں
گواہ تم بھی مری بندگی کے ہو جاؤ

درد آرام بنا، زخم کو سینا آیا
کتنی مشکل سے ہمیں چین سے جینا آیا

مدتوں ہم تری زلفوں میں گرفتار رہے
تب کہیں جا کے محبت کا قرینہ آیا

کتنا دشوار تھا گمنامی سے شہرت کا سفر
میں بلندی کی طرف زینہ بہ زینہ آیا

چاہتا تھا کہ مرا غم نہ کوئی دیکھ سکے
میری آنکھوں کو مگر اشک نہ پینا آیا

اک برس پہلے جو گزرا تھا قیامت کی طرح
تیری یادیں لیے پھر سے وہ مہینہ آیا

فاصلہ کفر سے ایمان کا بس اتنا تھا
ہم جو بت خانے سے نکلے تو مدینہ آیا

اتنا سفاک تھا قاتل کہ مرے قتل کے وقت
سلوٹیں آئیں نہ ماتھے پہ پسینہ آیا

بچ گئے لوگ مری جان کے صدقے میں شکیلؔ
میں جو ڈوبا تو کنارے پہ سفینہ آیا

❖

اس کو نزدیک کر کے دیکھتے ہیں
اپنی تضحیک کر کے دیکھتے ہیں

تیرگی ہی میں روشنی ہے تو
اور تاریک کر کے دیکھتے ہیں

اب یہ سوراخ تو نہیں بڑھتا
سوت باریک کر کے دیکھتے ہیں

یہ جو چھوٹی سی اک تمنا ہے
اس کو تحریک کر کے دیکھتے ہیں

یہ جو بگڑی ہے بن بھی سکتی ہے
اک ذرا ٹھیک کر کے دیکھتے ہیں

❖

یہ جو زمین کا تھوڑا سا حصہ گیلا ہے
یہی کسان کی اُمید کا وسیلہ ہے

یہ کہہ کے کتنوں کو زہراب دے دیا اس نے
شراب صاف ہے ساغر کا رنگ نیلا ہے

اک ایسے دریا کے مانند ہے مری ہستی
کوئی کنارہ ہے جس میں نہ کوئی ٹیلا ہے

یہ بھید ہم پہ کھلا اک حسیں کی قربت میں
گلاب میں ہے جو کانٹا بڑا نکیلا ہے

گمان ہوتا ہے چندن کی بو سے ناگن کا
شکیلؔ رنگ بھی آنکھوں کا اس کی نیلا ہے

گھر تو ہے، چھت کہاں گئی میری
وہ حکومت کہاں گئی میری

وہ رعایا جو ناز اُٹھاتی تھی
وہ ریاست کہاں گئی میری

بات کرتا تھا میں ہمالہ سے
اب وہ عظمت کہاں گئی میری

لوگ میرے خلاف ہونے لگے
وہ حمایت کہاں گئی میری

اتنی نفرت مرے لیے ہے کیوں
وہ محبت کہاں گئی میری

پاؤں اب راستوں سے ڈرتے ہیں
جانے وحشت کہاں گئی میری

وہ مرا بچپنا کہاں ہے اب
وہ شرارت کہاں گئی میری

دفن سینے میں مرے جانے بھرم کس کا ہے
دل کی دہلیز پہ یہ نقشِ قدم کس کا ہے

پھینک جاتا ہے ہر اک صبح مرے گھر میں گلاب
سوچتا ہوں کہ یہ اندازِ کرم کس کا ہے

یہ اگر سچ ہے مرا کوئی نہیں میرے سوا
زندگی پھر مرے حصّے میں یہ غم کس کا ہے

جس کے ہر رنگ سے تخریب کی بو آتی ہے
آؤ دیکھیں وہ فصیلوں پہ علم کس کا ہے

چشمِ انصاف میں چبھتی ہے چمک جس کی شکیلؔ
دستِ منصف میں وہ سونے کا قلم کس کا ہے

میری بنیاد کو تعمیر سے پہچانا جائے
مجھ کو عجلت نہیں تاخیر سے پہچانا جائے

میں کئی شکل میں رہتا ہوں بدن پر اپنے
میرا چہرہ مری تحریر سے پہچانا جائے

کوئی سمجھے مری خاموش نگاہوں کی صدا
درد میرا مری تصویر سے پہچانا جائے

آنکھ کا دیکھا ہوا جھوٹ بھی ہو سکتا ہے
خواب کو خواب کی تعبیر سے پہچانا جائے

میں نے پانی کے لیے ریت اُڑائی ہے بہت
میری تقدیر کو تدبیر سے پہچانا جائے

میرے کاندھے سے اُتارے نہ کوئی میری صلیب
جرم میرا مری تعزیر سے پہچانا جائے

اس اندھیرے میں یہ جھنکار ہے شمعوں کی طرح
یعنی مجھ کو مری زنجیر سے پہچانا جائے

میرا سب کچھ مرے ماضی کے حوالے سے ہے
میرے منگل کو مرے پیر سے پہچانا جائے

درد بنا کوئی جیتا ہے
آنسو کون نہیں پیتا ہے

سارے سرکس اک جیسے ہیں
ہر سرکس میں اک چیتا ہے

درزی نے سیلونی سیکھی
نائی بھی کپڑے سیتا ہے

بازی ختم کہاں ہوتی تھی
ہم ہارے تو وہ جیتا ہے

تو کیا جانے ہار کے تجھ سے
میں نے سارا جگ جیتا ہے

ہندی اُردو دو بہنیں ہیں
اک مریم ہے اک سیتا ہے

میں مسلم ہوں ہندستانی
دل قرآن نظر گیتا ہے

شکیل اعظمی نئی نسل کے ان معدودے چند شعراء میں یقیناً نمایاں ہیں جو گروہی اور نظریاتی وابستگیوں سے نجات پاکر کھلے ذہن سے اپنے وجود کے تخلیقی سرچشمے سے رابطہ قائم کرتے ہیں او ر اپنے انفرادی لسانی اظہار کو وضع کرتے ہیں۔

۲۸ر مئی ۱۹۹۷ء (سری نگر) پروفیسر حامدی کاشمیری

تم بہت اچھے شاعر ہو تمہاری زبان شگفتگی اور تازگی لیے ہوئے ہے۔

۳۰ دسمبر ۱۹۹۶ء (لندن) ساقی فاروقی

شکیل اعظمی وہاں سے شاعری شروع کر رہے ہیں جہاں پہنچ کر میری شاعری دم توڑنے والی ہے۔ ان کی شاعری میں جو تازہ کاری ہے اس نے خاص طور سے مجھے متاثر کیا ہے۔ یکم مئی ۱۹۹۷ء (ممبئی) کیفی اعظمی

شکیل اعظمی کے یہاں اظہار و موضوع کی ہم رشتگی مستعمل پیرایوں سے الگ ہو کر ان کی شخصیت کی پہچان کراتی ہے۔ انہوں نے تقلیدی سلامت روی کے بجائے انفرادی تجربات کے خطرات مول لیے ہیں۔

۱۹ر اگست ۱۹۹۵ء (ممبئی) ندا فاضلی

تمہاری شاعری میں تمہارا اپنا رنگ ہے جو دل کو بھاتا ہے۔ اس کم عمری میں یہ پختگی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

۲۴ر جنوری ۱۹۹۶ء (احمد آباد) محمد علوی

آپ کے یہاں تخلیقی تازگی اور توانائی ہے جو فکر اور احساس دونوں سطحوں پر اپنا تاثر قائم کرتی ہے۔

۱۷ر مئی ۲۰۰۰ء (لکھنؤ) عرفان صدیقی

شکیل اعظمی اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے اپنے ننھیالی گاؤں 'سہریا' میں
۲۰/اپریل ۱۹۷۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن اعظم گڑھ کا ہی ایک موضع 'سیدھا
سلطانپور' ہے۔ ان کے والد کا نام وکیل احمد خان اور والدہ کا نام ستار النساء خان ہے،
والدہ کے انتقال کے بعد ان کی پرورش ان کی نانی نے کی وہ مکتب پڑھ کر بمبئی چلے
آئے اور پھر گجرات کے شہر بڑودہ چلے گئے۔ دو سال بڑودہ اور دو سال بھروچ میں
رہنے کے بعد وہ سورت آگئے اور یہاں دس برس گزارے۔ ۱۹۸۴ء میں انھوں نے
پہلی غزل بڑودہ میں کہی لیکن ان کی شاعری سورت میں پروان چڑھی۔ فروری ۲۰۰۱ء
میں وہ دوبارہ بمبئی آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی شاعری کے اب تک چار
مجموعے 'دھوپ دریا' (۱۹۹۶ء)، 'ایش ٹرے' (۲۰۰۰ء)، 'راستہ بلاتا ہے' (۲۰۰۵ء)
اور 'خزاں کا موسم رکا ہوا ہے' (۲۰۱۰ء) منظر عام پر آچکے ہیں۔ 'مٹی میں آسمان' ان کی
غزلوں اور نظموں کا پانچواں انتخاب ہے۔ انھیں ان کی کتابوں پر مختلف اردو اکادمیوں
سے نو انعام مل چکے ہیں۔ وہ ایک لاکھ روپے کے کیفی اعظمی ایوارڈ سے بھی نوازے
جا چکے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے بعد کے شعراء میں انھیں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ انھوں
نے فلم، ٹی وی اور کئی پرائیویٹ البم کے لیے بھی نغمے تحریر کیے ہیں۔ 'وہ ترا نام تھا،
مدہوشی، زہر، نظر، وہ لمحے، دھوکہ، دھوم دھڑاکہ، EMI، لائف ایکسپریس، ہانٹیڈ اور
1920 ایول ریٹرنس' وغیرہ ان کی خاص فلمیں ہیں۔ فلم 'مدہوشی' میں انھیں اسٹار ڈسٹ
ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ ان کی شہرت کا دائرہ ادب سے فلم تک اور فلم سے
مشاعرے تک پھیلا ہوا ہے، وہ خواص میں جتنے ممتاز ہیں عوام میں اتنے ہی مقبول ہیں۔

——ادارہ

**Mitti Men Asman**

Shakeel Azmi

arshiapublicationspvt@gmail.com